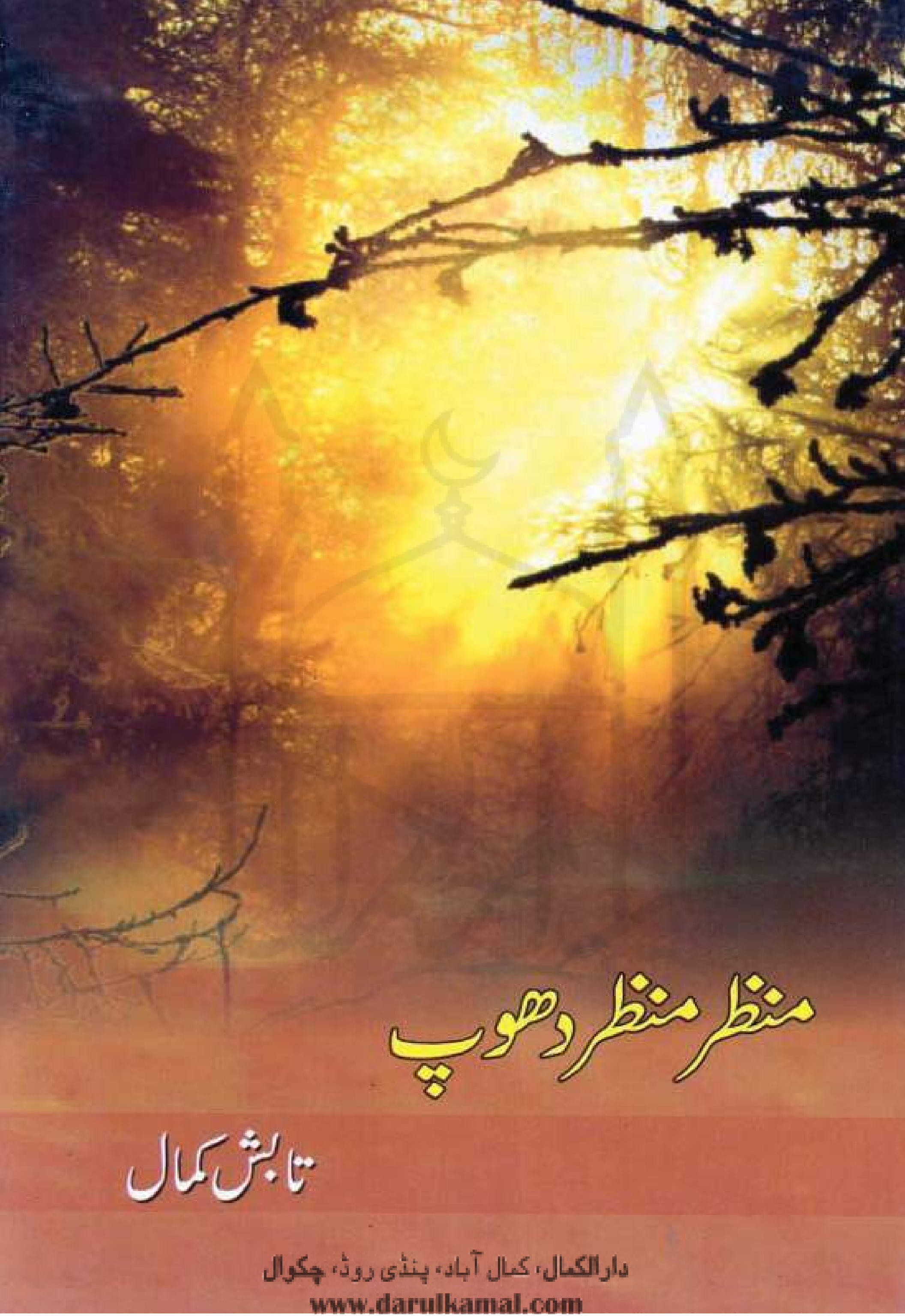


منظر منظر دھوپ

تابش کمال

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

منظر منظر دھوپ

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

ہماری بابِ سخن میں تابشؔ یہی تمنا رہی ہے دائم
کبھی تو لفظوں کے قفل کھلتے، کبھی تو اذنِ کلام ہوتا

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

منظر منظر دُھوپ

(غزلیں، نظمیں)

تابش کمال

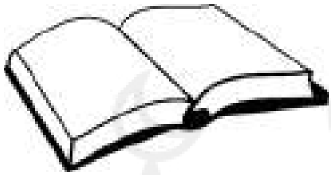
کمال پبلی کیشنز
راولپنڈی

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

کمال پبلی کیشنز

کی

کمال کتابیں



نام کتاب:	منظر منظر دھوپ
شاعر:	تابش کمال
نقشِ اوّل:	مارچ، 1998ء
نقشِ دوم:	مارچ، 2004ء
نقشِ سوم:	اگست، 2010ء
آرائش، اہتمام:	عابد سیال (0333-5193903)
تعداد:	ایک ہزار
قیمت:	125 روپے
مطبع:	پریمئیر پریس، راولپنڈی

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

تعارف

نام:	تابش کمال
ولدیت:	باغ حسین کمال
تاریخ پیدائش:	15 اپریل 1965ء
جائے پیدائش:	پنوال، چکوال، پنجاب، پاکستان
تعلیم:	ایم۔اے اردو، پنجابی (پنجاب یونیورسٹی)
ممبرشپ:	حلقہ اربابِ ذوق، راولپنڈی
	پاکستان رائٹرز گلڈ، پنجاب
تصانیف:	منظر منظر دھوپ (اردو شاعری)
	شام پئی بن شام (پنجابی شاعری)
	مہاجر پرندوں کی نظمیں (اردو شاعری)
	لوحِ کمال (مرتب)
	فرید سے فرید تک (ان چھپی)
رابطہ:	دارالکمال، نزد شیل پٹرول پمپ،
	پنڈی روڈ، چکوال۔
	موبائل: 0300-5144878

آنکھ نگر میں لکھّا تھا اِک بجھتا سورج، شام
قریۂ دل میں دیکھی لیکن منظر منظر دُھوپ

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

والدِ محترم

پروفیسر باغ حسین کمال رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

وقت کے تپتے صحرا میں جو آج بھی چھاؤں جیسے ہیں

انمول تھے یوسف کی طرح گھر سے چلے تھے
ہم شہر کے بازار میں بے دام بِکے ہیں

جس دور کی تقدیس کا پرچار ہے تابش!
اُس دور میں ہر گام پہ گلفام بِکے ہیں

ترتیب

پیرو مرشد حضرت باغ حسین کمالؒ کا ایک یادگار محبت نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہاسٹل انٹر کالج،
جہلم
۱۔ اکتوبر ۸۸ء

جانِ کمال — پیارے تابش!

ابھی آپ کا خوشبودار، پیارا سا خط ملا۔ تمہارا نامۂ محبت تمہارے حسنِ طبع کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ میں آپ کے اسلوبِ نگارش کی رعنائی اور رنگینی کا مسرت انگیز حیرت کے ساتھ مشرف ہوں۔ ماشاءاللہ تم میری توقع سے کہیں بڑھ کر میرے ذوقِ ادب اور شوقِ فکر کی میراث کو اپنا چکے ہو۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

آپ کے پودوں پر کھلنے والا پہلا پھول گلابی رنگ کا ہے۔

شاید آپ نہیں جانتے کہ یوں تو ہر پھول مجھے بھاتا ہے مگر گلاب میری کمزوری ہے — میرے مریدین کو بھی میری اس پسند کا علم ہو چکا ہے۔ اس لئے ان میں سے کچھ وقتاً فوقتاً گلاب کے پھولوں کا تحفہ لاتے رہتے ہیں۔ اور میں انہیں دیکھ کر باغ باغ ہوتا رہتا ہوں۔

منیر ڈنمارک چلا گیا ہے۔ جانے سے پہلے گلاب کی ایک فریم شدہ دلکش تصویر اپنی نشانی چھوڑ گیا ہے جسے میں نے اپنی میز پر سجا رکھا ہے۔ ایک ساتھی کھڑکی کے پردے لے آیا جو گلابوں سے مزین ہیں۔ یوں میرے اردگرد گلاب ہی گلاب بکھرے پڑے ہیں اور کمرہ گلزار کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ ایسی رنگین و رعنا فضا میں بڑی مدت کے بعد دفعتاً چند اشعار وارد ہو گئے ہیں —

میرے دل میں بھی کھلا ہے اک گلابِ آرزو!
اس کی خوشبو سے تری جاں بھی معطر ہو تو ہو

مسلسل اشک بہنے دو، محبت کا تقاضا ہے
مرے محبوب نے بھیجی ہے آنکھ اور دل کی سوغات

ملنے کی خوشی جیسے ادھوری سی ہے لگتی
تم ہو جو مجھے ملتے بھی بچھڑنے کے لیے ہو

تمھارے خط میں لکھا ہوا یہ شعر ـــ

یہ سرد رات، یہ تنہائی اور نیند کا بوجھ
ہم اپنے شہر میں ہوتے تو گھر گئے ہوتے

بہت بھایا ـــ تابش! میری دعا ہے کہ اللہ کریم تمھیں ایسے پیاروں کے ساتھ سے نوازیں جو حسنِ صورت، حسنِ سیرت اور حسنِ ذوق کے اعتبار سے تم جیسا ہو تاکہ تم پورے طور پر حسنِ حیات سے فیض یاب ہو سکو۔ اور جب تم معاشِ حیات میں مصروفیت کے بعد تھکے ماندے گھر لوٹو تو ایک حسین و خوشبودار ساتھی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ تمھارا استقبال کرے تمھاری تھکاوٹ اور زندگی کی تمام کلفتوں کو دور کرنے اور حقیقی مسرتوں اور راحتوں کے گلدستوں سے تمھارا آنگن آراستہ کرنے کا باعث بن جائے۔ اللہ کرے تمھارا گھر، گھر ہو اور وہ احساسِ غربت سے غبار آلود نہ ہو۔

"حالِ سفر" کا دوسرا ایڈیشن نسبتاً بہتر انداز میں کمال ہی طبع ہو کر آیا ہے۔ حضورؐ سے عرض کیا تھا۔ انہوں نے شعری مجموعہ الگ چھاپنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس میں نثری حصہ شامل نہیں ہونا چاہیے۔ کتاب کے نام کی منظوری بھی عطا ہو چکی ہے۔ یہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا، اس کا دیباچہ انشاء اللہ تعالیٰ جمیل یوسف صاحب اور تابش کمال صاحب لکھیں گے۔ اللہ حافظ!

تمھارا

کمال

تابشؔ کا کمال

جدید تر غزل گو شعراء کی صف میں تابشؔ کمال اپنے فن کی بعض منفرد خصوصیات کی وجہ سے نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کے کلام کی بڑی خوبی اس کی سلاست ہے۔ بڑی غزل کی اس سلاست کی روایت کا آغاز میر تقی میر سے ہوا جس نے بعد میں غالبؔ کے بدلے ہوئے اندازِ سخن کی غزلوں میں مزید نکھار پایا۔

تابش کمال کی غزل اسی روایت کا ایک خوشگوار پرتو ہے۔ ایسی غزل کی بنیادی خوبی بظاہر سلاست سہی، مگر اس کے مفاہیم کی گھمبیرتا وہ حقیقی جوہر ہے جو اس نوع کی غزلوں کا وصفِ خاص ہے۔ تابشؔ کمال بھی محض سلاستِ اظہار پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنے شعروں کی سیدھی سادی لفظیات میں اسرارِ حیات کو سموتا چلا جاتا ہے۔ مثالیں دے کر مَیں قارئین کا حق نہیں چھیننا چاہتا۔ میرا مقصد تابشؔ کمال کے فن کی اس خوبی کی صرف نشاندہی کرنا ہے۔

اس نوجوان شاعر کو انسانوں کے باہمی رشتوں کی نفسیات کے اظہار پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔ رشتہ کسی نوعیت کا بھی ہو، تابشؔ کمال کے ہاں اس کے مضمرات پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ وہ اس کی نفسیاتی گہرائی میں اتر جاتا ہے۔ یہ حقیقت تو مسلمہ ہے کہ غزل انسانی نفسیات کے

اظہار کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے مگر رشتوں کے بیشتر نفسیاتی مراحل طے کرنا اور سلیقے سے اپنے ردِّعمل کا اظہار کرنا ہر شاعر کے بس میں نہیں ہوتا۔ تابشؔ کمال اس جہت سے بھی کامیاب ٹھہرتا ہے کہ اپنے نفسیاتی تجزیوں کو غزل کی ڈکشن میں حُسنِ توازن کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔

پھر یہ نوجوان شاعر اپنے گرد و پیش سے، اس عصر سے جس میں وہ سانس لے رہا ہے، اور ان جدت طرازیوں اور انقلابی تغیّرات سے جو دورِ رواں کی پہچان ہیں، پورے اعتماد کے ساتھ ربط وضبط رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بیشتر اشعار وہ آئینے ہیں جن میں ہمارا معاشرہ، ہماری سیاست، ہمارے نظریات، ہمارے یقین اور اوہام مسلسل منعکس ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہ زندہ اور بیدار شعراء کی خصوصیت ہے اور تابشؔ کمال کو زمانے کی ان تمام پرتوں کا بھرپور شعور حاصل ہے۔

مَیں تفصیل میں جاتا مگر ابھی ابھی میرے ذہن میں تابشؔ کمال کے حوالے سے ایک شعر نمودار ہوا ہے۔ وہ پیش کر کے اجازت چاہوں گا کہ اس شعر کے اجمال میں افق تا افق کی تفاصیل پوشیدہ ہیں۔ شعر یہ ہے:

شعروں میں جمال بھر دیا ہے
تابشؔ نے کمال کر دیا ہے

احمد ندیم قاسمی

17 جنوری 1998ء
لاہور

اِکلاپے کے جنگلوں میں گُم شاعر

میری ایک پہچان ساغر صدیقی بھی ہے اور اس پہچان کی سرحدیں بھی نامعلوم ہیں لیکن ساغر کے حوالے سے تابشؔ کمال میری ذات میں، میرے باطن میں اور میری بُری بھلی شخصیت میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ آج اس کے شعری مجموعے کے لئے حرف و لفظ کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے مجھے یاد آرہا ہے کہ ساغر پر میری کتاب ''شکستِ ساغر'' تابشؔ کمال اور میرے درمیان ایک انمٹ رشتے کی ایسی بنیاد بن گئی ہے جس پر محبتوں کے عظیم تاج محل اس وقت تک تعمیر ہوتے رہیں گے جب تک کرّۂ ارض پر سے نفرتوں کے جہنم بجھ نہیں جاتے۔

ایک شاعر کے طور پر تابشؔ کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن مجھے اس کی شخصیت پر بات کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے کہ اس کے فن کے ساتھ ساتھ اس کی طلسماتی شخصیت نے بھی مجھے اس کے قریب ہونے پر مجبور کیا۔ مجھے یقین ہے کہ جواں نسل کے دانشوروں، شاعروں اور اہلِ علم کے حلقوں میں تابشؔ کمال کی پہچان کا یہ پہلو زیادہ تابناک سمجھا جائے گا کہ اس کے فکر و فن کی اساس تلاشِ ذات اور تکمیلِ ذات کا وہ شعور ہے جو فرد کو سب سے پہلے اکلاپے کے جنگلوں میں گم کر دیتا ہے اور پھر اپنے تخلیقی احساس کی مدد سے پوری کائنات سے جوڑ دیتا ہے۔

1989ء میں تابشؔ کے ساتھ حرف و لفظ کے حوالے سے جو مکالمہ شروع ہوا وہ آج بھی جاری ہے۔ گو تابشؔ بہت مختصر اور دھیمے لہجہ میں گفتگو کے کمال سے مرصّع ہے لیکن ایک شاعر ہونے کے ناتے اس کے فکری احساس کی گہرائی کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنی کھوج میں حدِ ادراک تک جا سکتے ہوں۔

تابشؔ نامہ نگاری کے ہنر سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔ وہ مجھے جب بھی خط لکھتا مَیں بے اختیار سوچنے لگتا کہ جو شخص خط اتنا دلکش لکھتا ہے وہ باتیں کیسی عمدہ کرتا ہوگا۔ مَیں نے ارادہ کیا کہ جب بھی میرا اسلام آباد جانے کا پروگرام بنا تابشؔ سے ملنے کی کوشش ضرور کروں گا۔

اور پھر ایک دن ''ساغر میلہ'' کے میزبان اسلم ملک کے ساتھ راولپنڈی کے سفر کے دوران میں تابشؔ سے ملنے، اسے دیکھنے اور اس سے ہمکلام ہونے کی صورتِ حال کا اندازہ لگاتا رہا۔ یہ جون 1990ء کا ذکر ہے۔

رات سفر میں گزری۔ دوسرے دن دوپہر اسلم ملک سے جدا ہو کر مَیں پیرودھائی پہنچا جو ملک بھر سے آنے جانے والی بسوں اور مسافروں کی دنیا ہے۔ مسافر خانوں، ہوٹلوں اور چائے خانوں کی قطاروں سے راستہ بناتے ہوئے اس ہوٹل میں تابشؔ کا پتہ پوچھا جہاں وہ ہر شام ادیب شاعر دوستوں اور عام ملنے جلنے والوں کی محفل سجاتا تھا۔ ہوٹل

والوں کے رویے سے یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ تابش کی ذات پیرودھائی کے پُرشور کاروباری ماحول میں ایک ایسا مرکز ہے جہاں سے محبت اور خلوص کی کرنیں جنم لیتی ہیں۔

مجھے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ لانبے قد کا ایک نوجوان ہوٹل میں داخل ہوا۔ میرے وجدان نے سرگوشی کی ''یہی تابش کمال ہے''۔ میرے بارے میں علم ہونے پر وہ بے تابی سے میری جانب آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ ہوٹل والوں کے اصرار کے باوجود وہ وہاں زیادہ دیر نہیں رکا اور مجھے اپنے کرائے کے اس کمرے میں لے گیا جہاں محمدی بستر تھا۔ ایک کونے میں کتابوں کا ڈھیر اس کی علم دوستی کا ثبوت پیش کر رہا تھا تو دیوار کے ساتھ گملوں میں لگے ہوئے پودے اس کی خوش ذوقی کی گواہی دے رہے تھے۔ لیکن مجھے جس چیز نے بہت حیران کیا وہ محمدی بستر کے سرہانے ایک پیاری سی سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی گڑیا تھی۔ مَیں نے دلچسپی سے پوچھا ''یہ کیا؟''۔ ''بانو'' اس نے یک لفظی جواب دے کر مزید کچھ پوچھنے کی گنجائش ختم کر دی۔

ہم کافی دیر کمرے میں بیٹھے رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جوں جوں شام قریب آ رہی تھی تابش کی کیفیت تبدیل ہو رہی تھی۔ اچانک اس نے کہا ''ذرا ہوٹل تک چلتے ہیں لوگ انتظار کر رہے ہوں گے''۔ ہم ہوٹل پہنچے تو دس بارہ لوگ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور

جب تک وہ بیٹھ نہیں گیا سب کھڑے رہے۔ مجھے ایک نوجوان کے لئے یہ جذبۂ تکریم دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی۔ اس نے سب سے میرا تعارف کرایا اور گفتگو ہونے لگی لیکن مَیں نے محسوس کیا کہ تابشؔ باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا اور وہاں موجود ہو کر بھی وہاں نہیں ہے۔ گفتگو مختلف موڑ کاٹتی ہوئی زندگی تک پہنچ گئی۔ سب اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ آخر کسی نے کہا ''تابشؔ صاحب! آپ بھی کچھ بولیے نا!''

اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا، سب کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور دھیمے لہجے میں بولا ''حیات پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ یہ مکمل طور پر بکھرنے بھی نہیں دیتی، سمٹنے بھی نہیں دیتی'' پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا ''ویسے سمٹنے کی کوشش بھی بے سود ہے۔ یہ کون سا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔''

ہم کافی دیر وہاں بیٹھے رہے، اچانک وہ اٹھا، سب سے معذرت کی اور مجھے لے کر ایک خالی ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ ''کمیٹی چوک'' اس نے ڈرائیور سے کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔ راستے میں اس نے کوئی خاص بات نہیں کی۔ بس رواں دواں ٹریفک دیکھتا رہا۔ کمیٹی چوک کے قریب پہنچ کر ڈرائیور نے گردن گھما کر ہمیں دیکھا اور پوچھا ''صاحب کہاں جائیں گے؟''۔ ''لاروش'' اس نے ایک بار پھر مختصر ترین جواب دے کر چُپ سادھ لی۔

ہوٹل میں آرڈر دیتے وقت تابش نے خاصی فیاضی کا ثبوت دیا لیکن خود اس نے بہت کم کھانا کھایا۔مَیں نے سبب پوچھا تو بولا ''ہوسکتا ہے میری مہر اتنے پہ ہی لگی ہو''۔ پھر کچھ دیر بعد لرزتی ہوئی آواز میں پوچھنے لگا۔''ویسے آپ کا کیا خیال ہے۔روزانہ کتنے لوگ کچھ کھائے پیئے بغیر سو جاتے ہوں گے۔''اس کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔مَیں نے اس کو مزید بوجھل ہونے سے بچانے کے لئے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور کافی دیر مری روڈ پر چہل قدمی کرنے کے بعد ہم ٹیکسی پکڑ کر دوبارہ اس کے کمرے میں آ گئے۔

رات گئے تک ساغر، شہر لاہور اور مختلف ادبی، سیاسی اور ثقافتی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ باتیں مَیں نے ہی کیں۔ وہ تو مختصر اور دھیمے لہجہ کی گفتگو کا بہت بڑا ماہر ہے اور اس کی ہر بات اس لحاظ سے مکمل اور خوبصورت ہوتی ہے کہ وہ سوچتا زیادہ اور بولتا کم ہے۔

اس دوران جانے کب مجھے نیند نے آ لیا۔رات کے آخری پہر اچانک میری آنکھ کھلی، کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور تابش کمرے میں نہیں تھا۔مَیں اسے کمرے میں نہ پا کر گھبرا سا گیا۔فوراً اٹھا اور گلی میں جھانکا تو عجیب منظر دیکھا۔ ردّی کاغذوں کا ایک ڈھیر پاس رکھے وہ محویت کے عالم میں بیٹھا تھا، آگ جل رہی تھی، جب ذرا سرد پڑنے لگتی وہ ایک کاغذ اٹھا کر آگ میں پھینکتا اور یوں شعلے دوبارہ بھڑک اٹھتے۔مَیں

دلچسپی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ جب کاغذوں کا ڈھیر راکھ میں تبدیل ہو چکا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خلافِ توقع مجھے سامنے پا کر گڑ بڑا گیا۔ پھر زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا'' نیند نہیں آ رہی تھی ،سوچا چراغاں کر لیا جائے۔ اگرچہ اس طرح اندھیرے مکمل طور پر ختم نہیں ہو جاتے لیکن پھر بھی کیا حرج ہے''۔مَیں اس کی بات سن کر اداس ہو گیا۔ واپس کمرے میں آ کر وہ دیر تک گُم صم بیٹھا دیواروں کو تکتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی تیر رہی تھی۔ مَیں نے سوچا ''یا خدا! اس چوبیس، پچیس سال کے لڑکے کا کیا بنے گا''۔

جو لوگ تابشؔ کو قریب سے جانتے ہیں وہ یقیناً اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ اس کی سوچوں کی پرواز کی فضائیں اس دنیا سے کس قدر مختلف ہیں۔ اس کے خواب عام سے خواب نہیں اور نہ ہی وہ اپنے مستقبل کے بارے میں اتنا فکر مند ہے۔ یہ بے نیازی اسے اس صوفیانہ فکر سے عطا ہوئی ہے۔ جو اسے ورثہ میں ملی ہے اور اس کے خون میں شامل ہے۔ ساغرؔ سے اس کی محبت بھی اسی صوفیانہ فکر، انسان دوستی اور سماجی و معاشرتی ناانصافی کے گہرے شعور کا نتیجہ ہے۔

تابشؔ کمال بڑے شہروں کی آپا دھاپی، افراتفری اور جرائم پرور سماجی و معاشرتی تنظیم سے دور چکوال کے موضع پنوال کے ایک ایسے گھرانے کا فرد ہے جہاں درویشی و مسکینی کی سلطنت ہے۔ اور وہ انسانی

شرف کی دولت سے مالا مال ہے۔ جاہ طلبی اور زر پرستی کی ہوس تابشؔ کو چھونے کی جرأت نہیں کرسکتی۔ وہ اپنے سینے میں محبتوں کے انمول خزانے لئے اس دور کی نفرتوں سے محفوظ زندگی بسر کرنے نہیں آیا بلکہ وہ زندگی کرنے کی آرزوؤں کا محافظ ہے۔

وہ اپنی شعری تخلیقات میں اپنی باطنی واردات کی سچائیوں کا اظہار پوری ایمانداری سے کرنا اپنا فنکارانہ فرض یقین کرتا ہے۔ وہ نفرت کرنا جانتا ہی نہیں۔ تابشؔ دھرتی کے بیگانۂ ذات لوگوں کا ترجمان ہے اوراس کا سفر تکمیلِ ذات کی طرف تیزی سے جاری ہے۔

اسے سچائی کے نام نہاد دعویداروں کی صف میں شمار ہونا گناہ لگتا ہے۔ ریزہ ریزہ، ٹوٹے پھوٹے اور ذات و وجود سے بیگانہ افراد میں زندگی کی شمع روشن دیکھنے کی تمنا اسے بے چین رکھتی ہے جو ہر روشن فکر تخلیق کار کا حقیقی منصب ہے۔

میرے سامنے اس کے شعری ہُنر کے لاتعداد شاہکار ہیں۔ وہ سماجی حقیقتوں کی المناکی کا اس فنکارانہ خلوص سے اظہار کرتا ہے کہ انسانی قدروں کی بے حرمتی کا سیناریو قلب ونظر پر چھا جاتا ہے۔اس کے تخلیقی تجربوں میں انسانی احساسات کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔محبتوں سے محروم افراد کے دُکھی جذبوں کی کہانی اس کے ہر شعر کو ایک لازوال تاثیر سے سجاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

تلاش اور جستجو اس کے روحانی کرب میں شامل ہے اور مَیں اس کے اس روحانی کرب کے گواہ کے طور پر اس کا یہ شعر اکثر گنگناتا رہتا ہوں:

افق کے پار کوئی حدِ نظر میں رکھے گی
تِری تلاش مسلسل سفر میں رکھے گی

یونس ادیب

13 دسمبر، 1997ء
لاہور

منظر منظر دھوپ

عقیدت

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

جس دن سے تیرے نام کی مشعل جلائی ہے
اس دن سے میرے گھر میں اندھیرا نہیں رہا

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

حمد

وقت کے دشتِ تاریک میں
کتنی صدیاں یونہی
مَیں بھٹکتا رہا
میرے ہونٹوں پہ لرزاں رہا دیر تک
ایک حرفِ دُعا
وقت کے دشتِ تاریک میں
خود سے اِک روز جب
مَیں بچھڑنے لگا
لے چلا تھام کر
روشنی کی طرف
ایک لمحہ کہ جو
تھا ترے نام کا

اقرار

مَیں تیرا نام جب بھی لوں
فضائیں گُنگنا اُٹھّیں
دیارِ دل کے سب گوشے
اچانک جگمگا اُٹھّیں
زمین و آسماں اِک دم
خوشی سے کھلکھلا اُٹھّیں
ہَوا میں خوشبوئیں بِکھریں
زباں میں شہد گُھل جائے
مَیں تیرا نام جب بھی لوں

○

مِری ذات بھی ، مِری بات بھی ، مِری شاعری تِرے نام سے
مَیں تھا اپنے آپ سے بے خبر ، مِلی آ گہی تِرے نام سے

تھی مُہیب تیرگی چار سُو ، تھا عجیب خوف سا رُوبرو
تجھے یاد کر کے مَیں رو پڑا ، مِلی روشنی تِرے نام سے

مَیں خزاں رسیدہ درخت تھا ، مِرا بے بہار سا بخت تھا
مِری شاخ شاخ پہ آ گئی نئی تازگی تِرے نام سے

تِرا ذکر دل کا سرُور ہے، تِری یاد آنکھ کا نور ہے
مِرے دل کے صحن میں کِھل اُٹھی کوئی چاندنی تِرے نام سے

مجھے تیرے نام سے پیار ہے، تِرا نام میرا وقار ہے
مَیں تو کل بھی تیرے طفیل تھا، مَیں ہُوں آج بھی تِرے نام سے

مِرے چشم ولب میں زبان میں کِھلے پھول سے رگِ جان میں
مِرا تلخ لہجہ مِرے نبیؐ ہُوا شبنمی تِرے نام سے

ترا نام ہی مِرا ورد ہو، یہی روشنی مِرے گرد ہو
یہی روشنی بنے زندگی، بنے زندگی تِرے نام سے

○

وہ نویدِ صبح ٹھہرا نام اُس کا روشنی
بے یقینی کے سفر میں وہ سراپا روشنی

ظلمتوں کے شہر میں سب راستے تاریک تھے
آنکھ میں اِک برق چمکی، دِل پکارا روشنی

اس میں خود پر بھی کُھلا، اسرار بھی روشن ہوئے
زندگی کی تیرگی میں ایک لمحہ، روشنی

وہ چمک اٹھیں فصیلیں، بام تابندہ ہوئے
اُن کے آنے سے ہوئی ہر سمت کیا کیا روشنی

اپنے ذہن و چشم و دِل تو دائمی ویران تھے
تیری چاہت نے انھیں آباد رکھا، روشنی !

اُن سے نسبت کو بھلا کیا نام دوں تابشؔ کمال!
میں سراپا تیرگی ہوں، وہ سراپا روشنی

○

مُجھ خطاکار پہ یہ چشمِ عنایت آقا!
کیسا خوش بخت ہُوں ، ہے آپ سے نسبت آقا!

اِس کو گنجینۂ قارون سے مطلب کیسا
دِل کو مِل جائے اگر درد کی دولت آقا!

سر جھکائے مَیں سرِ بزم کھڑا ہُوں کب سے
کوئی فرمانِ شفاعت مِری بابت آقا!

تیرے دیدار کا اعزاز بظاہر مشکل
پھر بھی قسمت سے جو آ جائے وہ ساعت آقا!

جب کبھی چاند کو آکاش پہ بڑھتا دیکھوں
یاد آتی ہے مجھے آپؐ کی ہجرت آقا!

میرے ہر لفظ کو درکار ستائش تیری
میری ہر سانس کو تیری ہی ضرورت آقا!

آپؐ چاہیں تو بھلا بات یہ مشکل کیا ہے
مُجھ پہ کُھل جائے کبھی میری حقیقت آقا!

وہ جو اِک شہرِ مدینہ ہے عرب میں واقع
دائم اُس شہر میں ہو میری سکونت آقا!

منظر منظر دھوپ

محبّت

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

جانِ تابشؔ ترے لئے یہ نظمیں غزلیں لکھنی تھیں
یہ مزدوری کرنا تھی سو برسوں ہم بے خواب ہوئے

○

اُترے گا کیسے پار سفینہ ترے بغیر
مشکل ہے اِس جہان میں جینا ترے بغیر

ویران ہے خیال کی ہر ایک رہگزر
سنسان ہے یہ دل کا مدینہ ترے بغیر

اتنی بلندیوں پہ بھی پستی نظر میں ہے
طے کر لیا تھا ہم نے یہ زینہ ترے بغیر

اِک چشمِ نیم باز سے ہی دل کی سمت دیکھ
کیسا بجھا بجھا ہے نگینہ ترے بغیر

غم ہائے روزگار کی ضد ہے گزار دوں
ساون کا میری جان! مہینہ، ترے بغیر

رِم جھِم تھی اور مُوڈ بھی زوروں پہ تھا مگر
چھلنی کیا ہواؤں نے سینہ ترے بغیر

○

کیا کہوں وہ کدھر نہیں رہتا
ہاں مگر اِس نگر نہیں رہتا

تُو ہو، تیرا خیال ہو یا خواب
کوئی بھی رات بھر نہیں رہتا

جب سکُوں ہی نہ دے سکے تو پھر
گھر کِسی طور گھر نہیں رہتا

جِس گھڑی چاہو تم چلے آؤ
مَیں کوئی چاند پر نہیں رہتا

لب کُھلیں تو زباں نہیں رہتی
سر اُٹھائیں تو سر نہیں رہتا

یُوں تو اپنی بھی جستجو ہے مجھے
تُجھ سے بھی بے خبر نہیں رہتا

دِل فگاروں کے شہر میں تابشؔ !
ایک بھی بخیہ گر نہیں رہتا

○

کبھی سُنی ہی نہیں شہر میں کوئی آواز
سما نہ پائی مِری لہر میں کوئی آواز

ترس گئے ہیں صداؤں کو کتنے گیت مِرے
نہیں ہے اِن کے لئے دہر میں کوئی آواز

تِرے دیار کی گلیوں میں ہُو کا عالم ہے
نہ شب کو شور نہ دوپہر میں کوئی آواز

ستم تو یہ ہے کہ خاموش مر گیا کوئی
اُبھر سکی نہ کبھی زہر میں کوئی آواز

کِسے مجال کہ لب کھولتا ترے آگے
دبی رہی ہے ترے قہر میں کوئی آواز

انا پرست ہیں چُپ چاپ ڈوب جائیں گے
سُنائی دے گی کِسے نہر میں کوئی آواز

○

کچھ تو اپنی آنکھ میں وہ شوق بھی دھندلا گیا
اور کچھ چڑھتا ہُوا وہ چاند بھی گہنا گیا

اَن گنت آلام سہہ کر جو بنایا تھا کبھی
وہ گھروندا کِس قدر آرام سے توڑا گیا

ہو چکے تھے جب در و دیوار سے مانوس ہم
تب اچانک ایک دن زنداں کا در کھولا گیا

شہر کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے
کچی بستی کی طرف دریا کا رُخ موڑا گیا

قیس نے بڑھ کر مِرے ہاتھوں کا بوسہ لے لیا
مَیں جو اِک دن سیر کرتا جانبِ صحرا گیا

جب ضرورت ہی نہ تھی تو مِل گئے کاندھے مگر
وقت پڑنے پر ہمیں بے دست و پا رکھا گیا

وہ بنا کر برف کا پیکر مجھے تابشؔ کمال !
چلچلاتی دھوپ کی پوشاک بھی پہنا گیا

چاندراتیں، بہار لمحے

وہ چاندراتیں، بہار لمحے
کہ جن کی خاطر
دعائیں کرتے ہوئے ہمارے
ٹھٹھرتے ہاتھوں میں کپکپی تھی
وہ جن کی خاطر
دُعائیں کرتے ہُوئے ہماری
نحیف پلکیں بھی جُھک گئی تھیں
وہ چاندراتیں، بہار لمحے
جو ہم نے باہم گزارنے تھے
وہ کتنی صدیوں سے
چاندنی کی ردائیں اوڑھے
گلاب ونرگس کے ہار لے کر
تمھارے آنے کے منتظر ہیں

○

وفا گزیدوں میں اپنا شمار کر ہی لیا
کِسی کی بات پہ پھر اعتبار کر ہی لیا

تِرے مزاج کے موسم کی خیر ہو، تُو نے
پھر اِک خزاں کو شریکِ بہار کر ہی لیا

یہ جانتے تھے کہ دریا چڑھا ہُوا ہے مگر
شکستہ ناؤ میں بیٹھے تو پار کر ہی لیا

○

روک لوں یا نہیں سوچتا رہ گیا
اُس کو جاتے ہُوئے دیکھتا رہ گیا

آرزو کی ہَری شاخ کمہلا گئی
پھول ارمان کا اَدھ کھِلا رہ گیا

حاصلِ گفتگو کیا ٹھہرتا بھلا!
ایک وہ لفظ جو اَن کہا رہ گیا

آج پھر مَیں نہیں جا سکا اُس طرف
آج پھر وہ دریچہ کُھلا رہ گیا

دُھل گئی دھیان سے کوئی صُورت مگر
نام اِک لوحِ دِل پر لکھا رہ گیا

کل اچانک کُھلا وہ مِرے دِل میں ہے
مَیں جِسے عمر بھر ڈھونڈتا رہ گیا

باس پھولوں کی پہنچی نہ دہلیز تک
کیک، ٹیبل پہ یونہی دھرا رہ گیا

شکر ہے ، رزمِ ہستی میں تابشؔ کمال!
فیصلہ جو ہو، حوصلہ رہ گیا

○

اُفق سے پار کوئی حد نظر میں رکھے گی
تِری تلاش مسلسل سفر میں رکھے گی

عجیب شے ہے تِری یاد جو بلا کی طرح
ہر ایک پَل مجھے اپنے اثر میں رکھے گی

کِسی کو علم نہیں سر پھِری ہَوا کا چلن
خبر نہیں ہے قدم کِس نگر میں رکھے گی

غُبار ہو کے بِکھر جاؤں گا تِری خاطر
تِری جدائی مجھے رہ گزر میں رکھے گی

ابھی حیات کو ساحل نہیں مِلا تابشؔ !
یہ ناؤ جانے کہاں تک بھنور میں رکھے گی

کالی کرنیں

جب بھی آس کا
سورج نکلے
مایوسی کے گہرے بادل
فوراََ ہی چھا جاتے ہیں
گر یہ بادل چھٹ بھی جائیں
شام کے سائے
تاریکی کو ساتھ لئے
پھر شب کی صورت
آ جاتے ہیں

اندیشہ ہائے دُور و دراز

کبھی پُوچھا ہَواؤں سے
کبھی تاروں کے جُھرمٹ سے
خدارا کچھ بتاؤ تو
کہ مُجھ سے دُور جا کر اب
ہے میری مہ جبیں کیسی
مگر کل جب اُسے دیکھا
اُنھی مانوس راہوں میں
تو مُجھ پر یہ کُھلا تابش
کہ اب تک کچھ نہیں بدلا
بجز آئینۂ دِل کے

○

رات اگر کچھ گُہر پرو جائے
صبح تسبیح پوری ہو جائے

دِل مچلتا ہے میرے سینے میں
جب کوئی اُس کے شہر کو جائے

بے یقینی کی یہ فضا کب تک
جو بھی ہونا ہے آج ہو جائے

جاگتی ہو جو رات کی رانی
کیسے ممکن ہے کوئی سو جائے

جینا مشکل ہے کِس قدر اے دوست!
خود سے بچھڑو تو عِلم ہو جائے

ابرِ وحشت کی کیا خبر تابشؔ!
ہم فقیروں کو کب بھگو جائے

○

بَن میں جی نہیں لگتا اور گھر اُداسی ہے
اب کُھلا مقدّر میں عمر بھر اُداسی ہے

شہر کی سبھی گلیاں تیرگی میں ڈوبی ہیں
کِس قدر خموشی ہے، کِس قدر اُداسی ہے

کیا خبر زمانے کو کیا کمائی ہے میری
ٹُوٹتی اُمیدیں، دُکھ، خواب، ڈر، اُداسی ہے

جاؤں تو کہاں جاؤں مُجھ پہ یہ نہیں کھلتا
کُو بہ کُو ہے تنہائی ، دَر بہ دَر اُداسی ہے

چُپ سے کِس طرح آخر یہ سکوت ٹُوٹے گا
کیوں خموش بیٹھا ہے ، بات کر ، اُداسی ہے

اور یہ مسافت بھی کٹ ہی جائے گی تابشؔ!
گو کہ ہر قدم اپنی ہم سفر اُداسی ہے

○

کوئی رستہ ہے نہ منزل اے دِل!
ایک مشکل ہے مقابل اے دِل!

کِس کو مہمان کریں ہم تیرا
کوئی تو ہو کِسی قابل اے دِل!

باعثِ رنج ہیں یادیں لیکن
بھولنا بھی تو ہے مشکل اے دِل!

صرف آنکھوں کو نہ ملزم ٹھہرا
تُو بھی تھا جُرم میں شامل اے دِل!

کاش ایسا ہو کہ دیکھیں اُس کو
ایک دن برسرِ محفل، اے دل!

ڈوب جانا ہی پڑے گا آخر
اب تو کشتی ہے نہ ساحل، اے دِل!

ایک دنیا ہے طلب گاروں میں
صرف تُو ہی نہیں سائل، اے دل!

بڑھ گئی اور بھی تیری وحشت
پھر ملاقات سے حاصل، اے دِل!

موسمِ گُل کی ہے آمد آمد
تُو کہاں ہے مگر اے دِل! اے دِل!

○

جانے کیوں ہیں آج گریزاں تابشؔ ! تیرے نام سے لوگ
یاد ہیں وہ دن مرتے تھے جب تُجھ پر بھی گلفام سے لوگ

دن بھر کی آوارہ گردی ، حاصل بس یہ ٹُوٹے خواب
کِس منہ سے اب جائیں اپنے گھر کو ہم ناکام سے لوگ

تیرے باعث بستی بھر میں کتنے وہ مشہور ہوئے
تیری محفل میں جو اِک دن بیٹھے تھے گُمنام سے لوگ

اب کے ہم نے عہد کِیا ہے راہ میں پیڑ لگائیں گے
ان کی چھاؤں میں شاید بیٹھیں پیہم بے آرام سے لوگ

جانے تُو کِس دیس گیا ہے لوٹ بھی آ اب میرے چاند
اپنی اپنی چھت پہ کھڑے ہیں تیری خاطر شام سے لوگ

چل جو پڑیں تو کوئی بھی منزل دُور کہاں رہ سکتی ہے
یونہی خوفزدہ ہیں تابشؔ! پہلے پہلے گام سے لوگ

نقش بناتے، نقش مٹاتے دیکھا ہے
لوگوں کو یوں خاک اُڑاتے دیکھا ہے

تیری راہیں تکنے والی پگلی کو
دِیپ جلاتے، دِیپ بجھاتے دیکھا ہے

جانے کِس کی خواہش کا پھر خون ہُوا
شاخ پہ پھر اِک گُل کمہلاتے دیکھا ہے

دِل میں تیرے ٹھکانے کا کچھ علم نہیں
ہم نے تجھ کو آتے جاتے دیکھا ہے

خوشبو کے سنگ اُڑتی تتلی کو تابشؔ !
دُور کھِلے اِک پھول کے ناتے دیکھا ہے

پہرے دار کا پُرسہ

ابھی تک تم نہیں سوئے
کہو، مَیں پُوچھ سکتا ہُوں
مسلسل رَت جگوں نے کیا دیا تم کو
یہ کِس کے منتظر ہو تم
شکستہ مقبروں پر کب کوئی آتا ہے
اُٹھّو تم بھی سو جاؤ
کہ تنہا بند کمرے میں یہ راتیں
ایسے کب تک تم گزارو گے
ہمہ مصروف دنیا میں
تمھاری آنکھ کا یہ دُکھ
کوئی بھی تو نہ دیکھے گا

ذرا سوچو

یہ دنیا ہے تماشائی
تماشوں کی تمنّائی
تماشا تم نہ بن جانا
یہ ضدا چھی نہیں ہوتی
یہ تم کیوں بھول جاتے ہو
کہ یوں آنسو بہانے سے
مسائل کم نہیں ہوتے

اُٹھو اب تم بھی سو جاؤ
مجھے آگے بھی جانا ہے

○

اِک سِرا تو ہے سلامت، دوسرا ٹُوٹا ہُوا
آؤ پھر سے جوڑ دیں، یہ سلسلہ ٹُوٹا ہُوا

اُس کو دیکھا اِک نظر تو دیکھتے ہی رہ گئے
اُس کے بعد اب خود سے بھی ہے رابطہ ٹُوٹا ہُوا

تم ہمارے دِل کے طالب اور ہم حیران ہیں
کیا کرو گے لے کے اب یہ آئینہ ٹُوٹا ہُوا

اِک تمنّا تھی مِری سو وہ شکستہ ہو چکی
ایک سپنا تھا مِرا جو رہ گیا ٹُوٹا ہُوا

مَیں نے جِس کو جوڑنے میں عمر اپنی کاٹ دی
آج وہ پیکر مجھے کہنے لگا ٹُوٹا ہُوا

مَیں ہُوا دریا میں غوطہ زن گُہر کے واسطے
اور لایا بھی تو کیا ، کچّا گھڑا ٹُوٹا ہُوا

مُدّتوں کے بعد تابشؔ ! وہ مِلا تو یہ کُھلا
ہم تو بکھرے ہی تھے لیکن وہ بھی تھا ٹُوٹا ہُوا

○

تُجھ کو پانے کی آس پر کوئی
تان بیٹھا ہے پھر شجر کوئی

تیری یادوں کی اِک حسیں چادر
سو گیا آج اوڑھ کر کوئی

سوچتا ہُوں جدا نہ ہو جائے
مُجھ کو مِلنے سے پیشتر کوئی

مُنقسم ہو گئے ہیں یارانے
اِس نگر کوئی، اُس نگر کوئی

پیشرو بھی نہ کر سکے ، ہم بھی
تبصرہ اِس حیات پر کوئی

اُس کو تابشؔ کمال کیا معلوم
کب سنورتا ہے ٹُوٹ کر کوئی

منزلیں گُم ہوگئیں جب راستوں کے درمیاں
سمت کیا دِکھلائی دے پھر گردشوں کے درمیاں

کِس میں دم خم ہے کہ ایسے میں گزارے ایک پَل
مَیں نے جیسے عمر کاٹی بھائیوں کے درمیاں

رفتہ رفتہ جا چکے ہیں چھوڑ کر تارے تمام
چاند تنہا رہ گیا ہے بادلوں کے درمیاں

شب زدوں کے شہر کو مژدہ دیا درویش نے
ہم اُجالے دیکھتے ہیں ظلمتوں کے درمیاں

حیرتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں میری دَم بہ دَم
رہ رہا ہُوں جس طرح مَیں آئنوں کے درمیاں

بے ہُنر لوگوں میں یوں پہچان ہے تابشؔ مِری
جِس طرح شیشہ پڑا ہو پتھروں کے درمیاں

سوچتا ہوں جانے اب کیا گُل کھِلائیں گی کمالؔ !
نفرتیں جو پَل رہی ہیں دوستوں کے درمیاں

تاکید

اُسے کہنا
اگر آئے

تو ساتھ اپنے
کوئی جگنو
کوئی تارا
بھی لے آئے

کہ میرا دِل
مِرے گھر کی طرح
تاریک رہتا ہے

○

اُس کے بعد ہُوئے ہیں تابشؔ ہم کتنے دِلگیر لکھو
ممکن ہو تو بھیجے اپنی پیاری سی تصویر لکھو

ہم جو تمھارے شہر میں اب تک تنہا اور افسردہ ہیں
اِس گرداب سے کیونکر نکلیں ایسی کوئی تدبیر لکھو

عشق کہانی کے کرداروں کے ناموں پہ جھگڑا کیا
جس کو چاہو سوہنی کہہ لو، جس کو چاہو ہیر لکھو

تابشؔ ! دن تو پھر بھی دن تھا روشنیوں میں بیت گیا
شام ڈھلے اب کالی شب کی فکر ہے دامن گیر لکھو

واہمہ

وہ عجب تھا کوئی
دیکھ کر
محوِ فکرِ سخن جو مجھے
میری ٹیبل پہ کچھ
آہٹیں رکھ گیا

○

وفا وہ شخص مِرے ساتھ بھی نہ کر پایا
بچھڑتے وقت ملاقات بھی نہ کر پایا

ستارے توڑ کے لانا تو غیر ممکن تھا
وہ میرے حق میں کوئی بات بھی نہ کر پایا

یہ دُکھ نہیں کہ رہیں بدگمانیاں تابشؔ !
یہ رنج ہے کہ شکایات بھی نہ کر پایا

○

ڈھونڈتا ہی رہا وادیٔ خواب میں
گھر کا مَیں راستہ ، وادیٔ خواب میں

گونجتی ہی رہی آہٹوں کی طرح
اِک صدا ، گُم شدہ ، وادیٔ خواب میں

پُوچھا اب کوئی صورت ملاقات کی
ہنس کے اُس نے کہا ''وادیٔ خواب میں''

رنگ اس کے لہو میں رچے رہ گئے
اِک پرندہ اُڑا وادیٔ خواب میں

ایک مَیں ، ایک وہ ، اِک ہَوا اور چاند
اور کچھ بھی نہ تھا وادیٔ خواب میں

یہ زمیں، آسماں ایک حیرت کدہ
جس کا ہر در کُھلا وادیٔ خواب میں

دل نے سحر ایسے باندھے کہ تابشؔ چلا
خواب کا سلسلہ ، وادیٔ خواب میں

○

کبھی اِس نگر تجھے دیکھنا، کبھی اُس نگر تجھے ڈھونڈنا
کبھی رات بھر تجھے سوچنا، کبھی رات بھر تجھے ڈھونڈنا

مجھے جا بجا تِری جستجو، تجھے ڈھونڈتا ہُوں مَیں کُو بہ کُو
کہاں کُھل سکا ترے رُوبرو مِرا اِس قدر تجھے ڈھونڈنا

مِرا خواب تھا کہ خیال تھا وہ عروج تھا کہ زوال تھا
کبھی عرش پر تجھے دیکھنا کبھی فرش پر تجھے ڈھونڈنا

یہاں ہر کِسی سے ہی بَیر ہے، تِرا شہر قریۂ غیر ہے
یہاں سہل بھی تو نہیں کوئی مِرے بے خبر تجھے ڈھونڈنا

تِری یاد آئی تو رو دیا، جو تُو مِل گیا تجھے کھو دیا
میرے سلسلے بھی عجیب ہیں تجھے چھوڑ کر تجھے ڈھونڈنا

یہ مِری غزل کا کمال ہے کہ تِری نظر کا جمال ہے
تجھے شعر شعر میں سوچنا، سرِ بام و دَر تجھے ڈھونڈنا

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

○

اُٹھا کر آنکھ دیکھا تک نہیں ہے
کِسی نے آج روکا تک نہیں ہے

سفر درپیش ہے اُن منزلوں کا
جہاں جانے کو رستہ تک نہیں ہے

درُونِ دِل سمندر موجزن تھا
مگر پلکوں پہ قطرہ تک نہیں ہے

بڑھے گی تشنگی کربل سے آگے
ہماری پیاس دریا تک نہیں ہے

مچل اُٹھّا ترِے ہونٹوں پہ کیسے
ابھی جو لفظ لکھا تک نہیں ہے

تصدق اسؐ کے سائے پر میں تابشؔ
بظاہر جس کا سایہ تک نہیں ہے

تاویل

زمانے بھر کے
مسائل پہ بات کرتے ہیں
تمھارے باب میں
لیکن خموش رہتے ہیں
تُو بدگُمان ہُوا کر نہ ایسی باتوں سے
ہمیں عزیز ہے
خود سے بھی آبرو تیری
ہم اِس لئے نہیں کرتے ہیں
گفتگو تیری

جواب نامہ بنام ناصحینِ شہر

ہمارا ہے کیا
ہم تو وہ لوگ ہیں
عہدِ طفلی میں ہی جو جواں ہو گئے
اب تمنّا کے کتنے ہی بیجوں کا پھل
یہ جواں فصل ہے جو کھڑی سامنے
اور مقدّر کی خوبی ذرا دیکھئے
یہ جوانی ہمارا بڑھاپا ہوئی

کوئی شہرِ سخن وَر سے بولے ذرا

فصل کیسے کٹے

جب کہ ہاتھوں میں اپنے

سکت ہی نہیں

سو ہمارا ہے کیا

ہم تو وہ لوگ ہیں

جو جوانی کے آتے ہی بوڑھے ہوئے

سمجھوتہ

اچھا تو پھر

یوں کرتے ہیں

اِتنی دُور تو

ساتھ چلو تم ......

رستے میں جب

پتھر آئیں، کانٹے آئیں

وہاں سے بے شک

ہاتھ چھڑا کر، عذر بنا کر

تم لوٹ آنا

○

منزلوں کی بات کرتے تھے گھروں میں بیٹھ کر
زخم اب وہ چاٹتے ہیں راستوں میں بیٹھ کر

ایک مَیں ہی تو نہیں ہُوں اور بھی کچھ لوگ ہیں
زندگی جو کر رہے ہیں ہوٹلوں میں بیٹھ کر

وہ جو خود سے بھی خفا تھا، دوستوں سے نا اُمید
اُس نے دِل کی بات کہہ دی دشمنوں میں بیٹھ کر

گفتگو کرتا تھا تابشؔ ! وہ ہمارے روبرو
اب اشارے کر رہا ہے آئنوں میں بیٹھ کر

○

تیرے ہجر میں بِیتا کیا
چرچا اِس کا کرنا کیا

سچ پوچھو تو ایک سے ہیں
جینا کیا اور مرنا کیا

گھر کی یہ زیبائش کیوں
کاگ منڈیر پہ بولا کیا

مَیں نے اپنے شعروں میں
کھینچا تیرا نقشہ کیا

اب اِس بات سے کیا حاصل
کھویا کیا اور پایا کیا

کیوں اِتنے خاموش ہو تُم
ٹُوٹا کوئی سپنا کیا

تابشؔ ! دونوں جھوٹے ہیں
چہرہ کیا، آئینہ کیا

○

رُخ بدلتی جا رہی ہے اب ہَوائے زندگی
چل رہی ہے زندگی کے سائے سائے زندگی

کُو بہ کُو تجھ کو پکاروں ، جا بجا آواز دُوں
اے بلائے زندگی ! اے کربلائے زندگی !

ایک ہی خواہش ہے میری اے بہارِ جانفزا!
تیری بانہوں میں سمٹ کر بیت جائے زندگی

مطمئن سے ہو گئے ہیں یہ حقیقت جان کر
اور بھی اِک زندگی ہے ماورائے زندگی

نامُرادی کے بھنور میں ڈُوبتے تابشؔ کمال!
کون تھا جو کہہ رہا تھا ہائے ہائے زندگی

○

کارِ مشکل ہے، کر رہا ہُوں مَیں
زخم یادوں کے بھر رہا ہُوں مَیں

رات کے خوف سے گزر آیا
اور اب دن سے ڈر رہا ہُوں مَیں

ایسا لگتا ہے تیرے بِن مُجھ کو
جیسے اندر سے مَر رہا ہُوں مَیں

تیری یادوں کے قصر سے اے دوست !
زینہ زینہ اُتر رہا ہُوں مَیں ☆

آئنے بھی سوال کرتے ہیں
اتنی مدّت کِدھر رہا ہُوں مَیں

پھر سمٹنے کے شوق میں تابشؔ!
رفتہ رفتہ بِکھر رہا ہُوں مَیں

☆ زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات........... فیضؔ

○

کیوں رویا تھا
کچھ تو ہُوا تھا

جانے وہ کیا
سوچ رہا تھا

تیرے ، میرے
بیچ خلا تھا

یاد کا دِل میں
پھول کِھلا تھا

مَیں پیہم دُکھ
جھیل رہا تھا

منزل، تیرا
نقشِ پا تھا

شکر ہے تیرا
درد مِلا تھا

تابشؔ اُس کا
حکم بجا تھا

○

عجیب خوف سا حائل دکھائی دیتا ہے
سفر حیات کا مشکل دکھائی دیتا ہے

بھنور کے بیچ گزاری ہے زندگی لیکن
ہمیشہ خواب میں ساحل دکھائی دیتا ہے

مَیں اپنے صحن کا یہ پیڑ کاٹ دوں کیسے
ہر ایک برگ میں اِک دِل دکھائی دیتا ہے

جواں رُتوں کے تصوّر میں آج تک وہ گُل
اِک آئینے کے مقابل دکھائی دیتا ہے

مَیں اپنے آپ سے کیسے اُسے جدا سمجھوں
مجھے وہ روح میں شامل دکھائی دیتا ہے

پڑے ہیں راہ میں تابشؔ کمال ! ہم لیکن
وہ ہمسفر سرِ منزل دکھائی دیتا ہے

اکیلے پن کے موسم میں

وہ مِل جاتا

تو اچھا تھا

کہ اُس دن

ہم نے کہنے کو

بہت کچھ سوچ رکھا تھا

وہ مِل جاتا

تو ہم اس بے خبر کو یہ خبر کرتے

''ہمارے زخم گہرے بھی ہیں، تازہ بھی''

وہ مِل جاتا

تو ہم کہتے

تمھارے بِن بھی آنگن میں

گلابی پھول کھلتے ہیں

مگر اِن میں

کوئی خوشبو نہیں ہوتی

وہ مِل جاتا

تو ہم کہتے

بسا اوقات دیکھا ہے

دھنک رنگوں کی پٹّی اور

اُس کے پار نیلے آسمانوں سے زمیں تک

نور کے بادل برستے ہیں

مگر جب تم نہیں ہوتے

ہمارا جی نہیں لگتا

○

تمھیں کیوں ہو رہا ہے اب ملال آہستہ آہستہ
ہمارے حق میں لکھّا تھا زوال آہستہ آہستہ

کِسی دن تم چلے آنا ، جواب اِس کا بتائیں گے
کبھی پُوچھا تھا جو تم نے سوال آہستہ آہستہ

نجانے کیا سبب ہے یہ کہ مُدّت سے نہیں آیا
وہ خواب آہستہ آہستہ، خیال آہستہ آہستہ

جو ہم نے خواب دیکھے تھے ابھی تک وہ ادھورے ہیں
گزرتا جا رہا ہے یہ بھی سال آہستہ آہستہ

فریبِ زیست کچھ دو چار دن کا دُکھ نہیں یارو!
ہمارے گرد پھیلا ہے یہ جال آہستہ آہستہ

کہیں گھبرا نہ جائے وہ اچانک آزمائش سے
پرکھ اُس کو، مگر تابشؔ کمال! آہستہ آہستہ

○

آؤ مِرے گھر
خوشبو بن کر

سر نیہوڑائیں
کِس کِس دَر پر

تیرے چرچے
آج ہیں گھر گھر

آتے ہو تم
یاد برابر

کھو جاتا ہے
رستہ اکثر

دشتِ کربل
اور بہتّر

میرا دِل ہے
ایک سمندر

کون چھپا ہے
دِل کے اندر

سب ہی تابشؔ !
مُجھ سے بہتر

○

دِل و دماغ پہ جو بار تھا ، نہیں اُترا
کہ لوحِ ذہن پہ مصرع نیا نہیں اُترا

ہر ایک سمت ہے طوفانِ رنگ و بُو لیکن
کوئی نگاہ میں تیرے سِوا نہیں اُترا

ہر ایک گام پہ ماں کی دُعائیں شامل تھیں
مَیں رزم گاہ میں بے دست و پا نہیں اُترا

جسے خدا نے اُتارا وہ آخری سچ ہے
اور اُسؐ کے بعد کوئی دوسرا نہیں اُترا

مرے رفیق صفِ دشمناں میں جا بیٹھے
مرے لیے یہ الم کچھ نیا نہیں اترا

کِسی کی یاد میں تابشؔ ! جو ایک شب گزری
اُس ایک شب کا ابھی تک نشہ نہیں اُترا

○

زندگی کی دھوپ میں درکار تھا سایہ ہمیں
آپ یوں بھُولے، پلٹ کر بھی نہیں پوچھا ہمیں

نقش ہو کر رہ گئی ہیں وصل کی کچھ ساعتیں
یاد آ کر رہ گیا اِک ہجر کا لمحہ ہمیں

تُو سمندر ہے، ہماری پیاس کی کچھ لاج رکھ
یُوں نہ اِک دو گھونٹ پانی کے لئے ترسا ہمیں

ایک میٹھا درد بھی دل میں کبھی پیدا ہوا !
کیا اکیلے میں کسی دن آپ نے سوچا ہمیں؟

ڈھونڈنے نکلے خرد تو ہم جُنوں سے بھی گئے
ہوش کے بیوپار میں مہنگا پڑا سودا ہمیں

چل پڑے تو منزلیں بھی دُور پیچھے رہ گئیں
دیکھتا ہی رہ گیا دُشوار سا رستہ ہمیں

سانحہ یہ ہے کہ اُس نے عمر بھر تابشؔ کمال !
قربتوں کے شوق میں ہم سے جدا رکھّا ہمیں

نئے سال میں جدائی کا انتظار

مِری جاں! یہ دسمبر ہے
(گزرتے سال کا یہ الوداعی ماہ)
کتنے غم، کئی خوشیوں کا حاصل
رنج کے ٹھٹھرے بدن پر
درد کا بوسہ
یہ گیارہ ماہ گزرے ہیں
مگر لگتا ہے جیسے کل
ہم اِک دُوجے کو سالِ نَو کی خوشیوں کی
مُبارک باد دینے کو مِلے تھے

آ، مِری جاں! آ

برس آغاز کرنے سے ذرا پہلے

ہم اِک دُوجے کو

آتے سال کی خوشیاں،

مبارک باد دینے کو مِلیں

پھر سے بچھڑ جائیں

بشارت

شب زدو!

آج کی رات

سونا نہیں

تختِ تیرہ شبی

بس اُلٹنے کو ہے

آج کی شب کوئی

روشنی بن کے

دِل میں اُترنے کو ہے

ایک خط کے جواب میں

ہجر کی تمازت میں
جسم یوں پگھلتا ہے
جیسے موم بتّی کو
آگ کوئی دِکھلا دے
اپنی عمر کی گاڑی
جانے کون رستوں پر
بھاگتی ہے، چلتی ہے

مَیں تو اِن ہَواؤں میں

جیسے خشک پتّا ہوں

اپنی ڈال سے ٹُوٹا

بے دَری کا نوحہ ہُوں

پہلے بیس برسوں میں

کیا شعور تھا میرا

پچھلے سات سالوں میں

نارسائی پائی ہے

چشمِ نارسا میں کچھ

خواب تھے جو غائب ہیں

حسرتیں، تمنّائیں

تار تار ارماں ہیں

اور مَیں اکیلا ہُوں

زندگی کا نوحہ بھی

کیا عجیب نوحہ ہے

جس کو لکھ سکوں بھی تو

کون دھیان دیتا ہے!

بے اماں مسافر کی

سسکیوں پہ، آہوں پر

کون کان دھرتا ہے!

اور کیا لکھوں آخر

خط زباں نہیں ہوتا

لفظ، لفظ ہوتے ہیں

ترجماں نہیں ہوتے

راز داں نہیں ہوتے

○

آنکھوں میں کچھ خواب سلگتے رہتے ہیں
پلکوں پر ارمان مچلتے رہتے ہیں

آتے ہیں خوش رنگ مناظر راہوں میں
پر ہم اپنی موج میں چلتے رہتے ہیں

رات کی رانی، چاند ستارے میرے ساتھ
شب بھر تیری باتیں کرتے رہتے ہیں

آ جاؤ تو مِل کر ان میں رنگ بھریں
ذہن میں کیا کیا خاکے بنتے رہتے ہیں

دِل کی بستی حشر تلک آباد رہے
شہروں کا کیا، شہر اُجڑتے رہتے ہیں

تابشؔ اب ہر بات کو دل پر کیا لینا
دنیا کے معیار بدلتے رہتے ہیں

○

کب یہ سوچا تھا کہ ایسا حادثہ ہو جائے گا
یوں اچانک آشنا، نا آشنا ہو جائے گا

اِک یزیدِ وقت آ کر پھر ہُوا مسند نشیں
اب یقیناً کربلا کا سانحہ ہو جائے گا

آج اپنی اور ہی سی کیفیت ہے دوستو !
دیکھ لینا آج مَیں نے جو کہا ، ہو جائے گا

اعتماد اپنی نگاہوں پر مجھے اِتنا تو ہے
اِک نظر جِس کو بھی دیکھا وہ مِرا ہو جائے گا

پہلے اپنی زندگی کی الجھنیں کچھ کم نہیں
اگلے لمحے میں نجانے اور کیا ہو جائے گا

جانے کب آ جائے رہ میں ترکِ ہمراہی کا موڑ
ایک دن یہ آسرا مجھ سے جدا ہو جائے گا

صحنِ دِل میں اب کوئی دیوار اُٹھا تابشؔ کمال!
ورنہ یہ بھی ہر کِسی کا راستہ ہو جائے گا

○

رُک گئی ہے آج گھر گھر ایک شامِ انتظار
ہو گئی سب کا مقدّر ایک شامِ انتظار

ثبت ہو جاتا ہے آنکھوں میں ترے آنے کا رنگ
نقش ہو جاتی ہے دِل پر ایک شامِ انتظار

تُجھ سے مِل کر بے کلی کچھ اور بھی بڑھ جائے گی
تیرے آنے سے ہے بہتر ایک شامِ انتظار

کیا خبر کتنی ہی شامیں یاد میں آباد ہیں
ذہن میں محفوظ ہے ہر ایک شامِ انتظار

اِس کے دامن سے لپٹ کر دُور کر سب تلخیاں
جانے پھر کب ہو میسّر ایک شامِ انتظار

ٹمٹماتے دِیپ سارے رکھ دیے دیوار پر
یوں گزاری گھر میں رہ کر ایک شامِ انتظار

اور پھر ایسا ہُوا، روتی رہی، روتی رہی
مُجھ سے مِل کر زندگی بھر ایک شامِ انتظار

صبح دَم جو گھر سے نکلے کیا وہ واپس آئیں گے
پُوچھتی ہے اب تو اکثر ایک شامِ انتظار

○

ایک تیری طلب کے سِوا کچھ نہیں
یہ زر و مال، جھوٹی انا، کچھ نہیں

اے سخی ! تیرے در سے تہی دست کو
حسبِ خواہش ابھی تک مِلا کچھ نہیں

آسمانوں پہ یُوں بے خبر ہے کوئی
خاک و خاشاک سے واسطہ کچھ نہیں

اجنبیّت سے جب خامشی کا سبب
اُس نے پُوچھا تو مَیں نے کہا ''کچھ نہیں''

دِل کے اوراق ویسے کے ویسے رہے
تیرے بعد ان پہ مَیں نے لکھا کچھ نہیں

ایک مُدّت سے گُم صُم ہے تابشؔ کمال
دیکھتا ہے مگر بولتا کچھ نہیں

○

مِرے حال پر بھی نظر کیجیے
یہ دُشوار تو ہے، مگر کیجیے

ابھی آزمائش کا آغاز ہے
ابھی سے نہ یوُں چشم تر کیجیے

نہ ہو خوف جِس کو کِسی رات کا
لہو سے اِک ایسی سحر کیجیے

زمانوں سے یہ غیر آباد ہے
کِسی روز دِل میں بھی گھر کیجیے

یہ پانی کی بوند اتنی ارزاں نہیں
ہُنر ہے تو اس کو گُہر کیجیے

بڑا بے خبر میرا صیّاد ہے
نکلنے کو ہیں پَر، خبر کیجیے

○

پیلی سرسوں ، اُجلے بچپن کی باتیں ہی بھُول گیا
رنگ میں نور مِلا تو مَیں بھی اپنی ہستی بھُول گیا

ناحق اب سکھلاتا ہے آداب مجھے وہ محفل کے
جِس کے سبب میں رفتہ رفتہ دُنیاداری بھُول گیا

وہ جو شیش محل میں بیٹھا پتھر گنتا رہتا تھا
خود اس پر جب سنگ اُٹھا تو ساری گنتی بھُول گیا

اِس سے بڑھ کر آپ ہی کہہ دیں اور ستم اب کیا ہوگا
سچ کی باتیں کرنے والا سچ کے معنی بھول گیا

وہ بھی تھا اِک وقت کہ مُجھ کو شہر کا نقشہ ازبر تھا
اب مَیں ہُوں کہ اپنی جانب کُھلتی کھڑکی بھُول گیا

واقعہ یہ ہے وہ بھی میرا نام بھلائے بیٹھا ہے
سانحہ یہ ہے مَیں بھی تابشؔ! باتیں اُس کی بھُول گیا

○

زندگانی تِری

مہربانی تِری

دیکھ سکتے نہیں

رائگانی تِری

خاک ہوتے گئے

خوب مانی تِری

اے، ہمیشہ رہے
یہ جوانی تِری

دُور کیسے کریں
بدگُمانی تِری

کیوں نہ پیارا ہو غم
ہے نشانی تِری

دشتِ ہستی ! بہت
خاک چھانی تِری

سب سے تابش ! جدا
ہے کہانی تِری

○

آنکھ پتھر ہوئی دیکھتے دیکھتے
ایسی حالت میں کیسے اُسے دیکھتے

ایک دُنیا نے میرا تماشا کیا
آپ بھی مُجھ کو بجھتے ہُوئے دیکھتے

تم پہ ہو جاتے اسرار سب منکشف
میری جانب اگر غور سے دیکھتے

پیچھے احباب تھے سامنے تھا عدو
مُڑ کے تکتے کہ ہم سامنے دیکھتے

درد کا سلسلہ ایسے رُکتا ہے کیا
ہر گھڑی زخم کو سوچتے، دیکھتے

اس کی آنکھوں میں تابش! عجب سحر تھا
آئنے تک اسے رہ گئے دیکھتے

بے مائیگی کا دُکھ

نہیں ہم
پھول آنگن کے
کہ کِھلتے ہی
جنھیں کوئی محبت سے
لگا لے اپنے کالر پر
سجا لے کوئی بالوں میں

ہمارا کیا
کہ ہم ٹھہرے
گُلِ صحرا
کِھلے تو
کِس کے دستِ مرمریں کا لمس
اپنا بخت ٹھہرے گا

سب تمھارے لئے

کِس آہستگی سے ہے محوِ سخن

گلابوں کی خوشبو چمن در چمن

تتلیوں کے دھنک رنگ، بادِ صبا

کِسی خوبصورت سی اِک یاد کا

مرمریں ہاتھ تھامے ہوئے

آ گئی رُوبرُو

آج کے دِن خیالات کی آب جُو

جیسے ماں مہرباں چاندنی رات میں

میری جاں!

اِن مبارک سے لمحات میں

کچھ ہمارے...... نہیں

سب تمھارے لئے

○

دیکھا تھا جیسا خواب میں ویسا نہیں ہُوا
دستک پہ میری ایک بھی دَر وا نہیں ہُوا

ورنہ تو بے شمار گریباں تھے تار تار
اچھا ہُوا بہار کا چرچا نہیں ہُوا

گرچہ فراتِ زیست میں پیاسے رہے مگر
ہم سے کسی یزید کو سجدہ نہیں ہوا

تکمیل کو ترستی رہیں تشنہ خواہشیں
اپنا تو کوئی کام بھی پورا نہیں ہُوا

دیکھا اُسے تو آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
تابشؔ کمال! آج یہ اچھا نہیں ہُوا

درد آنکھوں میں بو رہا ہے کون
یہ مِرا دِل بھگو رہا ہے کون

دھند میں کچھ نظر نہیں آتا
آنکھ کے پار رو رہا ہے کون

کون جانے مِری زمینوں میں
بیج نفرت کے بو رہا ہے کون

جانے کیوں رنگ سے مچلتے ہیں
دل میں تصویر ہو رہا ہے کون

اتنی مُدّت سے جاگتا ہوں کیوں
میرے بدلے میں سو رہا ہے کون

○

قریبِ ساحل مُجھ ایسے زندہ کو دفن کرنے کے منتظر ہیں
مَیں جانتا ہُوں کنارے والے مِرے اُبھرنے کے منتظر ہیں

ہیں چاہتوں کے چراغ روشن ، محبتوں کے گُلاب بکھرے
ہماری بستی کے لوگ کب سے تِرے گزرنے کے منتظر ہیں

ہمیں خبر ہے کہ دو گھڑی میں ہمیں یہ پھولوں میں تول دیں گے
یہ شہر والے بھی کیا عجب ہیں ، ہمارے مرنے کے منتظر ہیں

یہاں عبث ہے کِسی سے کوئی کِسی بھی لمحے اُمید رکھنا
یہاں تو سارے کئی دِنوں سے ترِے بکھرنے کے منتظر ہیں

یہ عین ممکن ہے کل تمھاری بیاضِ دل پر لکھے ہُوئے ہوں
وہ لفظ تابشؔ ! جو مُدّتوں سے کہیں اُترنے کے منتظر ہیں

○

رستے میں ہیں کانٹے، پتھر اور مقدّر دُھوپ
دیکھ کے مُجھ کو بن جاتی ہے چھاؤں بھی اکثر دُھوپ

کِس جانب ہم جائیں اب یہ اُلجھن ہے دَرپیش
گھر کے اندر حبس بلا کا، گھر سے باہر دُھوپ

ٹھنڈی ، میٹھی نیند سُلایا دے کر جِس کو چھاؤں
آج مقرّر کر دی اُس نے میرے سر پر دُھوپ

آنکھ نگر میں لکھّا تھا اِک بجھتا سورج، شام
قریۂ دِل میں دیکھی لیکن منظر منظر دُھوپ

آنگن میں تم پیڑ لگاؤ جتنے بھی چھتنار
آ جائے گی پھر بھی تابشؔ روپ بدل کر دُھوپ

ہم کاغذ پر اور پھولوں پر لکھیں پیار کے بول
ایک سخن وَر مَیں ہُوں تابشؔ، ایک سخن وَر دُھوپ

فردیات

لگے کہ جسم میں باقی رہا لہو بھی نہیں
اِسی لئے تو صدا ہائے ہاؤہُو بھی نہیں

ہمارے شہر میں چرچے ہیں اُس مغنّی کے
یہ اور بات کہ وہ اتنا خوش گُلو بھی نہیں

○

لَوٹ کر اِس طرف پھر جو آئیں نہیں
کتنے مانوس تھے اُن صداؤں سے ہم

اُس کی خواہش ہے تو آؤ تابشؔ کمال!
دست بردار ہو جائیں چھاؤں سے ہم

○

دو گھڑی کے سکون کی خاطر
ہم نے برسوں عذاب جھیلا ہے

اُس سے کہنا کہ آج تک اِک شخص
اُس کے ہوتے ہُوئے اکیلا ہے

○

ٹُوٹی نیّا تیر رہی تھی اِک موہُوم سہارے پر
کیسے کیسے منظر دیکھے ہم نے خواب کنارے پر

اُونچا اُڑنے کی خواہش میں آخر یہ انجام ہُوا
تابشؔ! رفتہ رفتہ اُس کے ٹُوٹ گئے ہیں سارے پَر

○

چاندنی، اشجار کی پرچھائیوں سے گُفتگو
کِس قدر دلچسپ تھی تنہائیوں سے گُفتگو

○

یوں نہ باتوں سے ٹالتے جایئے
کچھ تو کاسے میں ڈالتے جایئے

آج پتھر نہیں تو کیا صاحب
مُجھ پہ فقرے اُچھالتے جایئے

○

دریا، کشتی، موتی، سیپی، ساحل، ریت، کنارے، تم
مجھ کو اچھے لگتے ہیں سب سورج، چاند، ستارے، تم

○

بے سکونی تھی دِل میں جو کل تک
اُس میں شدّت مزید آئی ہے

اشک، آہیں، اُداسیاں لے کر
آج آنگن میں عید آئی ہے

○

بدلتے سانچوں میں ڈھال خود کو
سنبھال تابش کمال خود کو

عجیب الجھن میں پڑ گیا ہُوں
مَیں دے کے تیری مثال خود کو

○

یاد انگڑائی سی لے کر جاگی
آنکھ مخمور ہُوئی جاتی ہے

زیست جیسے کوئی بوڑھی عورت
درد سے چُور ہُوئی جاتی ہے

○

حبس کے موسم کو اِتنا بھی طول نہ دو
آ جائے گی خلقت ساری سڑکوں پر

○

ہم تو خواہاں تھے سربلندی کے
اُس نے لکھّا ہے سرِنگوں رہنا

شام ہونے پہ ایک شاعر کا
سخت مشکل ہے پُرسکوں رہنا

○

بدگُمانی کی گِرہ کو کھولنے سے فائدہ
اُس کا لہجہ تلخ ہے تو بولنے سے فائدہ

کب ہتھیلی کی لکیریں مٹ سکیں تابش کمالؔ
راکھ گزری ساعتوں کی ’’پھولنے‘‘ سے فائدہ

○

اپنے اِس پندار کے ہاتھوں کچھ تو آخر ہونا تھا
رستے کے ہر پیڑ کو چھوڑا، سر پر سورج تان لیا

○

کوئی خیال اچانک سمیٹ لیتا ہے
مَیں چاہوں بھی تو مکمل بکھر نہیں سکتا

○

اُس نے میرے ٹُوٹنے کا جب اشارہ کر دیا
مَیں نے خود ہی جسم و جاں کو پارہ پارہ کر دیا

○

ثبت ہیں آنکھ میں گھڑیاں تیرے ملنے اور بچھڑنے کی
نقش ہے اب تک میرے دِل پر موسم سُرخ گلابوں کا

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، **چکوال**
www.darulkamal.com

''منظر منظر دھوپ'' میں شامل چھوٹی بحر کی غزلوں نے اپنی سادگی کے باعث مجھے متاثر کیا۔ یہ غزلیں بیک وقت پابند نظموں کا تاثر لیے ہوئے ہیں اور رومانی نفسیاتی زندگی کا حال پورے التزام کے ساتھ کہتی ہیں۔

اختر عثمان

تابش کمال کا شعری مجموعہ ''منظر منظر دھوپ'' پڑھنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ توانا اور آفاقی ادب کی روح انسانی زندگی اور عصرِ حاضر کے واقعات کی نمائندگی کرنے میں ہی مضمر ہے۔ ان کی شاعری میں فقط حسن و جمال، عشق و محبت، ہجر و وصال کی کرشمہ سازیاں ہی نہیں بلکہ حاکم اور محکوم کے مسائل، زیردستوں کی بے بسی اور غریب طبقات کے ساتھ ناانصافیاں بھی ان کے عام موضوعات ہیں۔

ظفر اقبال ملک

پروفیسر باغ حسین کمال کے ہاں تابش کمال کا جنم گویا برگد کے درخت کی جگہ نئے برگد کا جنم ہے۔

حمید اللہ شاہ ہاشمی

''منظر منظر دھوپ'' کی شاعری بھی ذاتی واردات سے لے کر کائنات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ اس میں جا بجا بے ساختہ اظہار کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ شاعر نے کہیں بھی بھاری بھرکم الفاظ اور بے محل تراکیب اور استعاروں سے اپنی شاعری کو بوجھل نہیں ہونے دیا۔

قائم نقوی

تابش کمال اپنے عہد کے متضاد رویوں، ہر ساعت بدلتی زندگی کی گہما گہمی اور اس میں پاش پاش ہوتی ہوئی فرد کی مذہبی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کا استعارہ بخوبی جانتا ہے۔ اسے اپنی سادہ اور دل نشیں لفظیات اور فکری اظہار کی حدود و قیود پر پوری دسترس حاصل ہے۔

یوسف چوھدری

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com



شعروں میں جمال بھر دیا ہے
تابش نے کمال کر دیا ہے

(احمد ندیم قاسمی)

تابش کمال کی اداسی کہیں کہیں تو ذاتی، رومانی حوالے سے ہے اور زیادہ تر طبقاتی، قومی اور عالمگیر انسانی اجتماعی حوالوں سے۔ اگر ہم مارکیٹ اکانومی کے قوانین کی مطابقت میں پیدا کی جانے والی ''چلتر خوش کن شاعری'' کو سامنے رکھیں تو اس کے مقابلے میں تابش کمال کا اجتماعی حوالوں سے اداسی کا اظہار بھی مثبت دکھائی دے گا کہ اس سے اُس کا ایک ذمہ دار شاعر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

یوسف حسن

باغ حسین کمال کے وجود نے تابش کی شخصی تہذیب کی ہے۔ تابش کی واردات مکمل طور پر مذہب سے جڑی ہوئی ہے۔ ''منظر منظر دھوپ'' میں شامل کلام تاریکی کے اس دور میں روشنی کی امید دلاتا ہے۔

احسان اکبر

کیفیت اور طرح کی تیرے شعر میں تابش ہوتی ہے
جوں برف پگھلنے لگتی ہے، جوں دھوپ میں بارش ہوتی ہے

قیوم طاہر

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com